

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اشارات

ہر ذاتِ متصف کے لیے اپنے اوصاف کی حیثیت سے دو کمال تہا کرتے ہیں۔ ایک کمال تو یہ ہے کہ وہ جس صفت سے متصف ہے اس میں اوصاف کی انتہا کو پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کی ذات میں وہ صفت اتنی شدید ہو جائے کہ وہ دوسری ذوات تک متعدی ہو اور دوسروں کو بھی اسی صفت کے رنگ میں رنگ لے لے۔ برف کا کمال اول یہ ہے کہ وہ خود انتہا بچھے کی سرد ہے۔ اور کمال ثانی یہ کہ وہ دوسری چیزوں کو بھی سرد کر دیتی ہے۔ آگ کا کمال اول یہ ہے کہ وہ خود انتہا بجھے کی گرم ہے۔ اور کمال ثانی یہ کہ وہ آس پاس کی چیزوں کو بھی اپنی اسی کیفیت سے مُتکثف کر دیتی ہے۔ باطل پی حال نیکی اور بدی کا بھی ہے۔ نیک آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود نیکی کا محترم بن جائے۔ اور دوسرا کمال یہ کہ وہ اپنے اثر سے دوسروں کو بھی نیک بنا دے۔ اسی طرح بُرے آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود بدی کی صفت سے بدرجہ اتم متصف ہو۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی اس بدی کو دوسروں تک متعدی کر دے۔

اس قاعدہ کلیہ کے مطابق کافر اور مومن کے لیے بھی کمال کے دو مرتبے ہیں۔ کافر اگر نہ بجائے خود اپنے عقیدہ کفر میں راسخ اور مضبوط ہو تو وہ کمال کفر کے پہلے مرتبے میں ہے۔ اور اگر وہ کفر کی تبلیغ کرے، لوگوں کو راہِ حق سے روک کر باطل کی طرف کھینچ لانے کی کوشش کرے، اور اپنے زورِ بیان، یا زورِ مال، یا زورِ مشیر یا کسی دوسرے زور سے کفر کی اشاعت کرے، تو وہ کمال کفر کے دوسرے مرتبے کی بھی تحصیل کر لیتا ہے، اور ان دونوں مرتبوں کو جمع کرنے کے بعد اس کے لیے کمال کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح مومن اگر خود اپنے عقیدہ ایمان میں راسخ، اور اطاعتِ حق میں کامل ہو تو وہ کمال ایمان کے پہلے مرتبے پر فائز ہو گا۔ اور اگر اس میں یہ صفت اتنی شدید ہو جائے کہ وہ دوسروں میں بھی ایمان اور اطاعتِ حق کی تبلیغ و اشاعت کرنے لگے، اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اپنی زبان یا اپنے قلم، یا اپنے روپے یا اپنے دست و بازو یا اپنے

اور وسائل سے ایمان و اسلام کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرے، تو اس کو کمال ایمان کا دوسرا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد وہ پورا مومن کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اس مضمون کو سورہ ال عمران کے دسویں اور گیارھویں اور بارھویں رکوع میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پچھنے فرمایا۔

اے محمدان سے، کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو؟

قُلْ يَا هَلْ أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِالْبَيِّنَاتِ
اللَّهُ -

پھر فرمایا:

کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے روکتے اور اس راہ کو ٹھیکھا کرنا چاہتے ہو؟

قُلْ يَا هَلْ أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ
اللَّهُ مِنْ آمَنَ تَبِعُونَهَا عَوَجًا

یہ دونوں آیات صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ کفر کا پہلا کمال، آیات الہی کا خود منکر ہونا ہے، اور دوسرا کمال اس کفر کی اشاعت کرنا، اور لوگوں کو خدا کے سیدھے راستے سے روکنا، اور اعتقاد و عمل کے ٹیڑھے راستے ان کے سامنے پیش کرنا ہے۔

اس کے بعد مومنون سے خطاب شروع ہوتا ہے، اور ان سے بھی دو باتیں کہی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ: اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو، اور جب سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے، ہو اور پرانگندہ نہ ہو جاؤ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ
وَلَا تَتَّبِعُوا إِلَّا مَا أُنزِلَ مِنْكُمْ مَسْمُوعًا ۚ وَاعْتَصِمُوا
بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

دوسرے یہ کہ:

اتوم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے

وَلَكِنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ

يَا مَرءُونَ بِالْحَرُوفِ وَيَتَلَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
 وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ -
 جو نیکی کی طرف بلائی ہو اچھے کام کا حکم دیتی ہو اور بُرے
 کام سے روکتی ہو۔ اور تلاح پانے والے ایسے ہی لوگ ہیں۔

یہاں ایمان کے بھی دو درجے بتا دیے ہیں۔ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مومن خود اللہ سے ڈرنے والا ہو،
 اور مرتے دم تک اوامرِ الہی کا مطیع رہے، اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے رکھے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے
 کہ وہ اپنے دوسرے اپناٹے نوح کو بھی نیکی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے۔

پھر کمالِ ثانی کے اندر بھی بہت سے مراتب ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مومن نبی، بحلی کا تقسمہ، چاند اور
 سوُج، سب پر مینر اور روشن گرمیوں کا اطلاق ہوتا ہے، مگر روشن گرمی میں ان کے مدارج، ہتفاوت ہیں۔
 مومن نبی صرف ایک حجرے کو روشن کر سکتی ہے بحلی کے تقسمے کی روشنی ایک بڑے مکان کی حد تک پھیل سکتی
 ہے، چاند کی روشنی زمین اور اس کے ارد گرد کی فضا تک محدود ہے۔ مگر سوُج تمام عالم کو اپنی روشنی سے
 چمکا رہا ہے۔ اور بہارِ پورا نظامِ شمسی اس کی روشنیوں سے منور ہے۔ اسی طرح مومن اپنے جیسے ایک
 انسان کے دل میں بھی ایمان کی شمع روشن کر دے تو وہ کمالِ ثانی کے مرتبے میں داخل ہو جائے گا۔
 لیکن یہ اس کمال کا پہلا درجہ ہوگا۔ پھر ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک میں دعوتِ الی الخیر کے
 مدارج ہیں۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ اس کی دعوتِ الی الخیر تمام عالمِ انسانی کے لیے عام ہو۔ وہ ساری
 دنیا کو نیکی کی طرف بلائے۔ پورے رُبعِ مسکوں میں اللہ کا فوجدار بن جائے، بدی اور منکر جہاں بھی ہو،
 اس کے استیصال کے لیے آستین چڑھائے۔ اور اپنے آپ کو کسی خاص برادری کسی خاص قوم، کسی خاص
 ملک، اور کسی خاص نسل، یا جغرافیائی حد کے اندر محدود نہ سمجھے۔ یہ کمالِ ایمان کا سب سے بڑا اور سب سے اونچا
 درجہ ہے۔ اور چونکہ حضرت حق جل مجدہ نے ہر معاملے میں مسلمانوں کے سامنے ایک بلندِ مصلح نظر پیش فرمایا
 ہے۔ اور کسی جگہ پست جوصلگی کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اس لیے آگے چل کر بارہویں رکوع میں، ان کو بتایا ہے
 کہ تم کمالِ ایمان کے اسی آخری درجے تک پہنچنے کے لیے ہو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
 تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے تم

تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (۱۲: ۳)

نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر
ایمان رکھتے ہو۔

آیت۔ وَتَلْتَمِذُونَ مِمَّنْ كَرِهُوا... الخ کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے اور
اس اختلاف کا منشا لفظ منکم ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ من یہاں تبعیض کے لیے نہیں بلکہ تبیین کے
لیے آیا ہے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں وہ تبعیض ہی کے لیے آیا ہے۔

پہلے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب کیا ہے
جیسا کہ فرمایا اَلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ يُرِيدُونَ عِزًّا مِّنْكُمْ وَرِجَالًا نَّصِيحِينَ يُخَوِّفُونَ اِلٰهَکُمْ بِالْحَقِّ
ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور بدی کو دفع کرے، خواہ ہاتھ سے کرے یا زبان سے کرے یا اور کچھ نہ ہو
سکے تو قلب ہی سے کرے۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم ایسی امت ہو جاؤ جو خیر کی طرف بلاتی
اور برائی سے روکتی ہو، کیونکہ من یہاں تبیین کے لیے ہے، اور اس کی مثال یہ آیت ہے: فَاجْتَنِبُوا
الرَّجِيسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (یعنی تلوں کی گندگی سے بچو نہ یہ کہ تلوں میں سے اس چیز سے بچو جو گندگی ہے)۔
دوسرا گروہ کہتا ہے کہ من یہاں تبعیض کے لیے آیا ہے، اور اس کے دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ
مسلمانوں میں ایک بڑا حصہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مرلضیوں پر مشتمل ہے جو دعوت الی الخیر اور
امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے واجبات ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے
لیے کچھ شرائط ہیں جو ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کے لیے خیر اور معروف اور منکر کا صحیح علم درکار ہے
اس کے لیے حکمت اور عقل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ آدمی پہلے خود کمال رتبے کا منتفی
اور پرہیزگار ہو، تب لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دے (دیکھو مقایع الغیب للامام الرضوی
وغریب القرآن للنیساوری، والوار التشریح للبیضاوی)

مگر کتاب اللہ اور سنت رسول میں تامل کرنے سے یہ اختلاف باسانی دور ہو سکتا ہے۔

ہم نے اوپر کلام اللہ سے مومن کے لیے دو کمال ثابت کیے ہیں۔ ان میں سے پہلا کمال یعنی خوف خدا اور اوامرِ اکہید کے آگے سر جھکا دینا اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہنا تو ذاتِ مومن کے ساتھ صفتِ ایمان کے نفسِ قیام کے لیے ضروری ہے۔ لہذا ہر مومن میں اس کمال کے کسی نہ کسی مرتبے کا متحقق ہونا لازم ہے کہ اگر وہ اس میں متحقق نہ ہو تو وہ مومن ہی نہ ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اگر چراغ میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغ ہی نہ ہوگا۔ اگر برف میں سردی نہ ہو تو وہ برف ہی نہ ہوگی۔ اگر آگ میں گرمی نہ ہو تو وہ آگ ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کو خطاب کر کے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِنْفِرُوا لِلّٰهِ حَتّٰی تَقْتُلُوْهُ اَوْ تَمُوْتُوْا اِنَّكُمْ مِّنْ سُلُوْلٍ وَّاغْنَضُمْوْا جَبَلٍ اللّٰهُ جَمِيْعًا وَلَا تَقْرَءُوْا۔ اس آیت میں تعجیض کا نام و نشان تک نہیں ہے بلکہ عموم کے ساتھ تاکید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان میں لازمی طور پر یہ صفات ہونی چاہئیں۔

دوسرا کمال تو وہ کمالِ ناید ہے جس کا متحقق ہونا، مومن کے مومن ہونے کے لیے نہیں، بلکہ اس کے کامل و مکمل اور بلند مرتبہ و عالی شان مومن ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اب اس کمال کے اعتبار سے ایک قوم کی دو ہی حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک حالت تو یہ ہے کہ پوری قوم کی قوم اس صفت کی حامل اور اس مرتبہ کمال پر فائز ہو۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ قوم کے کم از کم ایک حصہ میں کمالِ ایمان کا یہ اعلیٰ مرتبہ متحقق ہو اور باقی افراد صرف کمالِ اول سے متصف رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم اپنی حالت میں ہو یعنی اگر تمہاری پوری قوم دنیا میں آفتابِ ہدایت بن جائے، اور تمام اقوامِ عالم کو نبی کا حکم دینے والی اور بدی سے روکنے والی ہو، تو تم دنیا کی بہترین امت ہو گے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاهِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَذُوْهُمْ نُوْرٌ بِاللّٰهِ۔ لیکن اگر تم میں اس اعلیٰ مرتبے کی ہمت نہ ہو اور پوری قوم اس صفت سے متصف نہ ہو سکے، تو تمہارے اندر کم از کم ایک گروہ تو ایسا رہنا ہی چاہیے جو غیر کی طرف بلاناہ ہے اور بدی سے روکتا رہے۔ وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ۔ الخ۔ اسی لیے پہلی آیت میں عموم ہے مگر تاکید نہیں اور دوسری آیت میں تاکید

ہے مگر عموم نہیں۔

کمال ایمان کے یہ دو درجے، جن کا بار بار ذکر آ رہا ہے۔ صرف اعتبار میں دو ہیں ورنہ حقیقت میں تو دونوں ایک ہی ہیں جس شخص کے دل میں ایمان راسخ موجود ہوگا، اور جو اللہ سے ایسا ڈرنے والا ہوگا جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے، اس کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کو گمراہی میں مبتلا دیکھے اور اسے راہ حق کی طرف دعوت نہ دے۔ کہیں بدی کا وجود پائے اور اس کو مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ طبیعت مومن کی مثال ایسی ہے جیسے مشک، کہ راسخ ایمان اس کے حرم تک محدود نہیں رہتی بلکہ پھیلتی ہے جہاں تک پھیننے کا اس کو موقع ملے یا چراغ کہ نور ایمان سے جہاں وہ منور ہوا، اور اس نے آس پاس کی فضا میں اپنی شعاعیں پھیلا دیں۔ مشک میں جب تک خوشبو ہے گی وہ مشام جان کو معطر کرتا رہے گا۔ چراغ جب تک روشن رہے گا روشن کرتا رہے گا۔ مگر جب مشک کی خوشبو قریب سے قریب سونگھنے والے کو بھی محسوس نہ ہو، اور چراغ کی روشنی اپنے قریب ترین ماحول کو بھی روشن نہ کرے تو ہر شخص یہی حکم لگائے گا کہ مشک، مشک نہیں رہا۔ اور چراغ اپنی چراغیت کھو چکا ہے۔ یہی حال مومن کا ہے، کہ اگر وہ خیر کی طرف دعوت نہ دے، نیکی کا حکم نہ دے، بدی کو برداشت کرے اور اس سے روکے نہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں خوف خدا کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور ایمان کی روشنی مٹ گئی ہے۔

اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو لازم ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اور اگر استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان ہی سے ہی، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل میں اس کو برا سمجھے اور اس کے مٹانے کی خواہش رکھے، کیونکہ یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ اور اسی لیے قرآن مجید میں مومنوں کی عام صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ لَعُظُمَاءُ وَلِيَاءٌ
لَعُظْمَاءُ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ - (۹۱:۹) -

مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے حامی اور مددگار
ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ اور بدی سے روکتے
ہیں۔

الْمُتَّقِينَ الْعَبِيدُونَ الْحَمِيدُونَ
السَّاجِدُونَ الرَّكِعُونَ السُّجُودُونَ
الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ - (۱۳:۹) -
الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ
أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ -

وہ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، خدا کی حمد کرنے
والے، خدا کی راہ میں سفر کرنے والے، رکوع و سجدہ کرنے
والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے
اور حدودِ الہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے ان کو زمین میں طاقت بخش
دی تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں
گے اور بدی سے روکیں گے۔

پھر جب کہ مومن کی ضروری صفات میں سے ایک صفت امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے
تو کیا وجہ ہے کہ اس کی حیثیت فرض کفایہ کی سی رکھی گئی، اور اس معاملے میں اتنی نرمی کی گئی کہ مسلمانوں
کی پوری قوم میں سے صرف ایک جماعت کا امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہونا کافی سمجھا گیا؟ اس کا
جواب یہ ہے کہ خدا علیہم و آلہم و سلم کو معلوم تھا کہ عہد رسالت کے گزر جانے کے بعد مسلمانوں کے ایمان
ضعیف تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا یہ قوم ماہل متزل ہوتی جائے گی۔
حتیٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ کہ مٹوں مسلمان دنیا میں موجود ہوں گے مگر ان کی شمع ایمان میں اتنی
روشنی بھی نہ ہوگی کہ اپنے قریبی ماحول ہی کو منور کر سکیں، بلکہ ظلمتِ کفر کے غلبے سے خود ان کے اپنے
نور کے بجھ جانے کا خوف ہوگا۔ لہذا ایسی حالتوں کے لیے اس نے فرمایا کہ تمہارے اندر کم از کم ایک
ایسی جماعت تو ضرور ہی موجود رہنی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دینے والی، اور بدی کا مقابلہ
کرنے والی ہو۔ کیونکہ اگر تمہارے اندر ایسی ایک جماعت بھی نہ رہے تو پھر تم کو عذابِ الہی، اور قطعی

ہلاکت و تباہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس مضمون کو قرآن مجید میں خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

لَعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ
عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ
بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝
كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن نَّذْرِنَا
فَعَلُوهُ ۚ لَئِن سَأَلْنَا مَا
كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝
دوسری جگہ فرمایا :-

قُلْ لَّا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن تَبْلِكُمُ
أُولَٰئِكَ يَتَّبِعُونَ عَنِ الْفَسَادِ فِي
الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا ۚ وَسَمْنَا
أَتَجْنِبْنَا مِنْهُمُ وَإِتَّبَعَ الَّذِينَ
ظَلَمُوا ۖ مَا أَتَوْا قِيَمَتَهُ
وَمَا كَانَ بِرَبِّكَ لِيَهْلِكَ
الْقَرْنَىٰ بِظُلْمِهِمْ وَأَهْلَاهُمْ
مُضِلِّحِينَ ۝ (۱۰۳)

تم سے پہلے کی قوموں میں کچھ لوگ ایسے کیوں نہ ہوئے
جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔ ان میں ایسے
لوگ اگر تھے بھی تو وہ بہت کم تھے سوائے ان کو ہم نے
نہات دے دی۔ باقی رہے ظالم لوگ تو وہ مجرم تھے،
تو اسے نبی تیرا بایسا نہیں ہے کہ سبقتوں کو تو نبی ظلم
سے ہلاک کرے، ورنہ ایک دن کے باشندے نیکو کار ہوں۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان فرمایا ہے کہ :-

ان الله لا يعذب العامة لجمل خاصة
حتى يروا المنكر بين ظهرانيهم و هم
قادرون على ان ينكروا فلا ينكروا . فاذا
فعلوا ذلك عذب الله الخاصة والعامة .
رواه احمد

اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے بڑے اعمال کی سزا نہیں
دیتا جب تک کہ نوبت یہاں تک نہ پہنچ جائے کہ وہ اپنے
سامنے بڑے کام ہوتے دیکھیں، اور ان کو روکنے کی قدرت
رکھتے ہوں اور پھر نہ روکیں جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں
تو اللہ خاص اور عام سب پر عذاب نازل کرتا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:-

والذی نفسی بیدہ لتا صرت

بالمعروف ولتنهن عن المنکر و

لتاخذن علی بید المستی ولنظرنہ علی

الحق اطراء اولیٰ بن اللہ قلوب بعضکم

علی بعض اولیٰ بعضکم کما لعنہم (رواہ الترمذی)

و ابوداؤد وابن ماجہ باختلاف قلیل)

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم پر لازم ہے

کہ نیکی کا حکم دو، بدی سے روکو، اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے

حق کی طرف موڑو ورنہ اللہ تمہارے دلوں کی برائیاں ایک

دوسرے پر مسلط کر دے گا۔ یا تم پر اس طرح لعنت کرے گا۔

جس طرح کفار بنی اسرائیل پر کی۔

پس یہ بات واضح ہو گئی کہ آیت **وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ...** الخ میں جو تعبیر ہے، وہ اس معنی میں

نہیں ہے کہ مسلمانوں میں سے صرف ایک ہی ایسی جماعت مطلوب ہے جو داعی الی الخیر اور آمر بالمعروف

اور نایہ عن المنکر ہو اور باقی مسلمانوں کے لیے اس خدمت کا بجالانا واجب نہیں ہے بلکہ دراصل اس کے

معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں میں کم از کم ایک جماعت تو ایسی ضرور ہی رہنی چاہیے جو خیر کی شمع روشن رکھے

اور شر کی ظلمت کو دفع کرتی رہے۔ اگر ایسی ایک جماعت بھی ان میں موجود نہ رہی تو خیر امت ہونا تو درکنار

اس قوم کا عذاب الہی اور لعنت خداوندی سے بچ جانا بھی محال ہے۔